Attribution-Noncommercial 4.0 International (CC BY-NC 4.0)
DOI No. https://doi.org/ 10.57156/bazyaft24447758
Submitted on: 22April 2024   Accepted on: 02 July 2024   Published on: 03 July 2024

اردو فکشن: لا تشکیلی پڑھت اور معنی کے نئے تناظرات

Urdu Fiction: Deconstructive reading and new perspectives of meaning

Dr. Khurram Shehzad
Assistant Professor, Department of Urdu
Govt. Graduate College QadirPur Ran, Multan

ABSTRACT:

After clarifying the concept of deconstructive reading in this research paper, it is demonstrated that this style of reading not only addresses characters with binary oppositions, such as male/female, West/East, human/animal, in fiction (Short story and Novel), but also challenges hierarchical conceptions. As a result, the established hierarchical order is dismantled, and the logic of supplementation, carrying the significance of marginalized perspectives, takes precedence. Through an important example from Urdu fiction (Afsana: "Bhola") an effort is made to highlight the accommodation of misunderstood characters and perspectives. This mode of reading can include new dimensions in the analysis of Urdu fiction and its philosophical examination of marginalized characters and perspectives.

Key words: Deconstruction, Reading, Jacques Derrida, Urdu Fiction, Short Story, Bhola

پڑھت کیا ہے؟ بظاہر سادہ اور معمولی نظر آنے والا سوال ہے تاہم اپنی بنیاد میں پیچیدگی رکھتا ہے کیوں کہ انتقادِ ادبیات کی بنیاد اسی سوال پر قائم ہے۔ یعنی دنیا بھر کے ادبی نظریات اور معیارات در اصل اسی ایک سوال کی

وضاحت قرار دیے جاسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف، قاری اور متن کی تکون میں (پڑھت کے نتیجے میں) کبھی تو مصنف کو معنی کا مرکزی حوالہ سمجھا جاتا تھا پھر اس ضمن میں قاری کو اہمیت ملی اور بعد ازاں پسِ ساختیاتی کلامیے (Discourse) نے متن کی آزاد اور خود مختار حیثیت پر زور دیا۔ چناں چہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ پڑھت اپنی نہاد میں ایک پیچیدہ عمل ہے اور مختلف زاویے رکھتا ہے۔ انھی میں سے ایک زاویہ لاتشکیل (Deconstruction) ہے۔

لاتشکیل کا تعلق ژاک دریدا (Jacques Derrida) [1930-2004] سے ہے اور اسے ایک ایسا فلسفیانہ تصور کہا جاسکتا ہے جسے دریدا نے افلاطون (Plato) سے مارٹن ہائیڈیگر (Martin Heidegger) تک کی مغربی فلسفے کی پڑھت کے دوران دریافت کیا تھا۔ اس کے فلسفے کی رو سے کہا جاسکتا ہے کہ روایتی پڑھت کا عمل لفظ مرکزیت (Logocentrism) رکھتا ہے جس کی وجہ سے قاری کو مصنف کا منشا اور مقصد عزیز رہتا تھا سو معنی کی بازیابی دراصل مصنف کے ارادے کی بازیابی بن جاتی تھی اور تحریر کو محض تقریر کا ضمیمہ (Supplement) مان لیا جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو اس نہج سے متن کی پہچان، گوشت پوست کے انسان کی یادگار کے طور پر قائم ہوتی تھی اور مصنف کا تصور، مخصوص مابعد الطبیعیات (Metaphysics) میں ڈھل جاتا تھا۔ البتہ اس فلسفے کی رو سے مصنف کی ذات ایک ایسا بوجھ ہے جو (قاری کی غفلت کے سبب) زبان پر مسلط ہوتا آیا ہے۔ کیوں کہ قاری، زبان کو شفاف ذریعہ اظہار سمجھتا تھا۔ چناں چہ مصنف کے ارادے، منشا یا مراد کو پیش کرنا ہی زبان کا بنیادی وظیفہ سمجھا گیا۔ چناں چہ لاتشکیلی قرات کے آغاز پر ہی اس اصول کو نظر انداز کرنا پڑے گا کیوں کہ اس پر ژاک دریدا کا اعتراض ہے کہ اسے دوسرے بہت سے عوامل کی طرح (بلا تفتیش) قبول کر لیا گیا جس کے نتیجے میں تحریر کا تصور بے دخل ہو گیا۔ (1) یعنی تحریر کو تقریر کا نمائندہ تسلیم کرنے کے بعد قاری کی ہر ممکن کوشش یہ ہو جاتی ہے کہ متن کو مصنف کے منشا کا پابند بنالیا جائے جس کے نتیجے میں تحریر کی سائنس نظر انداز ہو جاتی تھی مزید یہ کہ پس اندازی کی اس کوشش کا آغاز یونان سے ہوا۔ اس ضمن میں افلاطون کی کتاب: فیدرس (Phaedrus) میں موجود سقراط اور اس کے شاگرد فیدرس کے درمیان ہونے والے اس مکالمے کی مثال دی جاسکتی ہے جس میں سقراط کا موقف تھا کہ جب کسی بات کو تحریر کر لیا جاتا ہے تو اس کی غلط تعبیر کا خطرہ بڑھ جاتا ہے جب کہ تقریر کے دوران مقرر خود موجود ہوتا ہے سو اس کا اندازِ بیان حقیقی مفہوم کو سمجھنے میں سامعین کی مدد کرتا ہے۔ ژاک دریدا نے تقریر سے وابستہ اسی موجودگی کو تنقید کا نشانہ بنایا اور بتایا کہ تحریر کی مذمت اس لیے کی گئی تھی کیوں کہ اس کی وجہ سے گوشت پوست کا مصنف موت سے ہمکنار ہو جاتا تھا۔ (2) اس رائے کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ مصنف کی

موجودگی کا مسئلہ اڑھائی ہزار سالہ روایت رکھتا ہے اور صدیوں سے تقریر نے تحریر کا استحصال کیا ہے۔ چناں چہ لا تشکیلی پڑھت کا اولین مقصد اس حیثیت کو واگزار کروانا ہے جو تقریر کا ضمیمہ ہونے کے بجائے آزاد اور خود مختار ہو۔

اس وجہ سے یہ فلسفہ قرات کا ایک ایسا نکتہ نظر ہے جس نے تفہیم اور تعبیر کے روایتی زاویوں کو انقلابی بنیادوں پر موضوع بنایا۔ یعنی پہلے اگر زبان کو فکر کے ماتحت سمجھا جاتا تھا تو اس نے فکر کو زبان کے تابع بتانے کے بعد اعلان کر دیا: "متن سے باہر کچھ نہیں ہے۔"(3) اور اضدادی جوڑے(Binary Opposition) کے مابین قائم ہونے والی فوقیتی ترتیب(Hierarchy) میں ضمیمے(Supplement) کی حیثیت رکھنے والے تصور کی نہ صرف میزبانی ہونی چاہیے بلکہ صلے کی تمنا سے عاری ہو کر (اسے) تحفے سے بھی نوازنا چاہیے۔(4) ایسا کرنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دریدا کے لفظوں میں لا تشکیل ہی انصاف ہے(5) یعنی لا تشکیل کا بنیادی وظیفہ ہی انصاف کے قیام کو عمل میں لانا ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دو اضدادی جوڑوں کے مابین قائم ہونے والی فوقیتی ترتیب کو توڑ کر ضمیمہ جاتی منطق کے حامل زیریں تصور کو برابری کی سطح پر لانے کے بعد اس کا تفصیلی مطالعہ نہ کر لیا جائے۔ گویا (سابقہ) زیریں تصور کو ملنے والا نیا مقام نہ صرف لا تشکیل کی جانب سے ملنے والی میزبانی ہے بلکہ اسطرحنئے مقام کو تحفہ بمعنی رعایت بھی کہا جا سکتا ہے۔ وضاحت طلب بات یہ کہ یہاں 'رعایت' کا لفظ اس لیے استعمال کیا جا رہا ہے کہ کسی ایک تصور کے برعکس دوسرے کو تفویض ہونے والی (زیادہ) اہمیت اگرچہ لا تشکیل کے بنیادی وظیفے کے حوالے سے ایک خطرہ ہے کیوں کہ اس کے نتیجے میں نئی فوقیتی ترتیب(Hierarchy) کے پیدا ہونے کا احتمال رہے گا تاہماس امکان کے حوالے سے رعایتفراہم کرنا ہی تحفہ(Gift) عطا کرنے کے مترادف ہے (جس کا جواز) طویل روایت رکھنے والے استحصال نے فراہم کیا ہے۔ یہ لا تشکیلی فلسفے کا ایک ایسا پہلو ہے جو اسے فلسفے یا حتّٰی کہ ادب تک محدود نہیں رہنے دیتا بلکہ سیاسی، ثقافتی، سماجی اور پس نو آبادیاتی مطالعات تک محیط ہے۔

اب تک کی بحث کو سمیٹنے اور لا تشکیلی پڑھت کے دوران اصول مرتب کرنے کی غرض سے حسبِ ذیل نکات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے:

۱۔ زبان کو معنی کی ترسیل کا شفاف ذریعہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ زبان کا تعلق نشانات کی سائنس سے ہے۔

۲۔ نشانات کی سائنس کے طور پر زبان کا تصور دراصل ایک ایسا عمل ہے جو معنی نما(Signifier) سے شروع ہوتا ہے اور فرق والتوا(Differance) کے نتیجے میں معنی کا غیر حتمی حوالہ بن جاتا ہے۔

۳۔ معنی آفرینی کے کھیل میں 'معنی' فقط ایک ایسا راستہ (Trace) قرار پائے گا جس پر غیر متوقع پڑاؤ آتے رہتے ہیں۔

۴۔ مصنف کا ارادہ یا منشا بے دخل ہو جاتا ہے یعنی سچ کا روایتی تصور برطرف ہو جائے گا اور ادبی متن کی 'صحیح' اور واحد تعبیر ممکن نہیں رہے گی۔

۵۔ متن میں آنے والے اضدادی جوڑے مثلاً اچھائی\برائی، مرد\عورت، حاضر\غائب، مشرقی\مغربی، مہذب\غیر مہذب، فطری\غیر فطری، شہری\دیہاتی، فرزانگی\دیوانگی وغیرہ جیسے تضادات کو بنیاد بنا کر (طے شدہ) فوقیتی ترتیب کا خاتمہ اور اس کے بعد دوسرے (The Other) کے طور پر شناخت رکھنے والے کردار یا تصور کو ضمیمہ جاتی منطق سے عاری ہو کر زیرِ بحث لانا، ایک ایسی دعوت ہے جو زبان کی طرف سے ہمیشہ عام رہتی ہے۔ چناں چہ اس کا پاس رکھنا ناگزیر ہو جائے گا۔

۶۔ سماجی توثیق (Affirmation) کی حیثیت رکھنے والے ان متنی حوالوں کو زیرِ بحث لایا جائے جو بیانیے (Narrative) میں ملفوف نظریات کا درجہ رکھتے ہیں۔

درج بالا نکات کے حوالے سے پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یوں تو ان نکات کو لا تشکیلی فلسفے کی مجموعی بحث سے اخذ کیا گیا ہے تاہم یاد رکھنا چاہیے کہ یہ بحث اپنی بنیادوں میں فلسفہ ہے۔ چناں چہ اس شناخت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسے کسی کلیے (Formula) کی حیثیت میں متن پر منطبق نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اس حوالے سے تنبیہ خود اسی فلسفے کے پیش کارنے کر رکھی ہے کہ یہ کسی قاعدے کو وضع کرنے؛ نظریے کو قائم کرنے؛ تعبیر کا پہلو تلاشنے؛ کلامیے کی نشاندہی کرنے یا اصول کو متن پر منطبق کرنے ہی کی بات نہیں ہے (6) لہٰذہ اس احتیاط کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ ژاک دریدا نے یہاں ایک خطرے کا اشارہ دیا تھا تا کہ یہ فلسفہ بھی کسی حتمی فکر سے منسلک ہو کر سابقہ نظریات کی توثیق کا ایسا وسیلہ نہ بن جائے جو طے شدہ تصورِ معنی (Signified) پر منتج ہوتا ہے۔

اس کے باوجود گنوائے گئے نکات کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے چوں کہا نہیں لا تشکیلی فلسفے کی مبادیات سے اخذ کیا گیا ہے اس لیے یہ نکات لا تشکیلی پڑھت کے دوران معاون ثابت ہو سکتے ہیں اور اگر متن کا تعلق اردو زبان سے ہو تو اس کی لا تشکیلی پڑھت کے دوران یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اردو دنیا سے اس فلسفے کی مطابقت دو سطحوں پر استوار ہو گی:

اول: اردو فکشن میں معنی کے نئے تناظرات قائم ہوں گے۔

دوم: یہ فلسفہ اردو ادب سے متعلق آوازوں کو مغربی ادب کے دوسرے(The Other) کی حیثیت میں اس طرح شناخت دلوائے گا جس سے مغرب پر اس کی مخصوص میزبانی واجب ہو جاتی ہے۔

محولہ بالا دونوں نکات کی بنیاد پر رائے دی جاسکتی ہے کہ مغرب سے میزبانی کا حق رکھنے کے باوجود ضروری ہے کہ پہلے لا تشکیلی مطالعات کے ذریعے اردو ادب کی مختلف آوازوں یا کرداروں کا مخصوص مطالعہ کر لیا جائے۔ چناں چہ اس ضمن میں اردو کے ایک اہم افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کے معروف افسانے: ''بھولا'' کا مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔ عموماً اس افسانے کو ''بچپن کی معصومیت اور تجسس کا افسانہ گردانہ جاتا ہے۔''(7) تاہم یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے رائے نما(حتمی) جملوں کی بنیاد وہ تاثر ہے جو مجموعی طور پر استوار ہوتا ہے اور متن کی کلی شناخت کو مصنف کے ارادے سے ماخوذ سمجھنے کا پابند بناتا ہے۔ اس سب کا آغاز اس تشکیل کے ماتحت رہتا ہے جو ایک کے بعد ایک واقعے کی مدد سے مرتب ہوتی ہے۔ یہی تشکیل، متن کے لیے کلی حیثیت کا حوالہ بن جاتی ہے اور متن کی مجموعی شناخت کو عنوان سے وابستہ دکھانے کا تاثر دیتی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے افسانے کے عنوان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ مذکورہ بالا جملے کے عقب میں عنوان: 'بھولا' ہی کارفرما ہے جو قاری کو بھول پن اور معصومیت کا اشارہ دیتا ہے۔ یعنی بھولا وہ ہوگا جو چالاکی اور عیاری سے پاک ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کی پڑھت کا انحصار متن میں موجود اس قسم کے جملے: ''بھولا یہ بات نہ سمجھ سکا کہ ایک شخص کس طرح ایک ہی وقت میں کسی کا بھائی اور کسی کا ماموں ہو سکتا ہے''(8) پر رہتا ہے اور قرین قیاس لگنے لگتا ہے کہ بھولا اس افسانے کا مرکزی کردار ہے اس لیے پوری کہانی دراصل اس کے بھول پن کا بیان ہے لیکن لا تشکیلی پڑھت کے دوران قاری کی پڑھت کا دارومدار متن کے حوالے سے مجموعی تاثر کے بجائے متن کی مختلف اکائیوں پر رہنا چاہیے۔ جس کے نتیجے میں اس قسم کے جملے:

> وہ گیتا محض اس وجہ سے سنتا تھا کہ وہ کہانیوں کا شوقین تھا اور گیتا کے ادھیائے کے آخر میں مہاتم سن کر وہ بہت خوش ہوتا۔ اور پھر جوہڑ کے کنارے اگی ہوئی دوب کی مخملی تلواروں میں بیٹھ کر گھنٹوں ان مہاتموں پر غور کیا کرتا۔(9)

معنی آفرینی کا نیا حوالہ بن سکتے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کے جملے پہلی صورت میں بھی پڑھت کا حصہ رہتے ہیں لیکن قاری کی توجہ اس جانب مبذول نہیں ہونے دیتے کہ 'بھولا' اس قابل بھی ہو سکتا ہے کہ اساطیری کرداروں کے نروان یا نجات کے مختلف پہلوئوں پر غور کر سکے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ سمجھی جاسکتی کہ افسانے میں مرتب ہونے والے بیانیے کا تعلق بچے سے ہے اس لیے متن میں موجود تفکر اور استدلال کا مذکورہ پہلو خود بخود نظر انداز ہو جائے گا۔ تاہم غور

کیا جائے تو اس عدم قبولیت کا سبب یہی نہیں بلکہ ایک ایسی تشکیل بھی ہے جسے مصنف نے مختلف تفصیلات کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ یعنی افسانے کا عنوان؛ بچے کو ملنے والی مرکزی حیثیت اور متن کی وحدت کا تصور وغیرہ کچھ ایسے عوامل ہیں جو کلیت میں قاری کی فہم کا ذریعہ بنتے ہیں اور معنی نما(Signifier) کی حیثیت میں 'بھولا' فرق اور التوا یعنی (Differance) سے دوچار نہیں ہو پاتا۔ البتہ تحریر کی سائنس کے بدولت متن کی وحدت کا تصور رد ہو سکتا ہے اور نشان (Sign) سے تعلق رکھنے والی افتراق کی وہ خاصیت سامنے آتی ہے جو 'بھولا' میں بھول پن اور عقل مندی جیسی مختلف جہتوں کو یکجا کر سکتی ہے۔ نتیجتاً افسانے میں بچپن کی معصومیت تلاش کرنے کے بجائے اس خرد مندی کو دیکھا جا سکے گا جو سماجی توثیق کی حیثیت میں قبول کیے جانے والے بیانیے میں مضمر تصورات کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے اور بھٹکے ہوئے مسافروں کی رہنمائی جیسا (جسارت مند) قدم اٹھا سکتی ہے۔ گویا پڑھت کے اس انداز میں (ماموں کی تلاش میں، رات کے پچھلے پہر نکلنا) بھولے کی معصومیت یا تجسس کا حوالہ نہیں ہو گا بلکہ سمت نمائی جیسی ذمہ داری قرار پائے گا۔

ابھی تک کی پڑھت میں بآسانی دیکھا جا سکتا ہے کہ بھولے کو اہمیت دی گئی ہے اور اس سے تعلق رکھنے والے جملوں کو بنیاد بنا کر معنی کی بحث کو تقویت ملی ہے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس مطالعے کی وجہ مذکورہ کردار کو ملنے والی وہ مرکزی حیثیت ہے جسے مصنف نے تجویز کیا تھا؟ چناں چہ 'بھولے' کی مرکزیت کو بے دخل کر دیا جائے تو 'دادا' کا کردار اہم ہو جائے گا۔ کیوں کہ یہی اس کہانی کا راوی بھی ہے اور اس کی زبان سے ادا ہونے والے اس قسم کے جملے:

> مایا بیوہ تھی اور سماج اسے اچھے کپڑے پہننے اور خوشی کی بات میں حصہ لینے سے بھی روکتا تھا میں نے بار ہا مایا کو اچھے کپڑے، پہننے، ہنسنے کھیلنے کی تلقین کرتے ہوئے سماج کی پروانہ کرنے کے لئے کہا تھا۔(10)

اسے اہمیت دلواتے ہیں۔ تاہم اس کردار کو ملنے والی اہمیت کے حوالے سے (پیش کردہ جملے کی بنیاد پر) کہا جا سکتا ہے کہ اول تو اس کی وجہ سماجی توثیق کی حیثیت رکھنے والے بیانیے سے انحراف ہے اور دوم یہ کہ راوی کے طور پر 'دادا' مصنف کا قائم مقام ہے اور قاری کی اسی ضرورت کو پورا کر رہا ہے جو بیان کرنے والے کی حیثیت میں مصنف کو نقاب فراہم کر رہی تھی۔

'بھولا' اور 'دادا' دونوں کرداروں کا تعلق حاضر کرداروں سے ہے چناں چہ ان کا دوسرا (Other) یعنی غیر حاضر کردار 'ماموں' قرار پائے گا کیوں کہ افسانے میں اس کی موجودگی نہ کے برابر ہے البتہ اپنی بیوہ بہن سے

راکھی بندھوانے کے لیے خود اسی کے گھر آنے والا ہے جب کہ (متن میں بتایا جا چکا ہے کہ) اس رسم کی ادائیگی کے لیے بہنیں جایا کرتی ہیں مگر بہن کی آسانی کے پیشِ نظر بھائی کی طرف سے سفر کرنا گویا سماجی رسم کی ادائیگی میں انحراف کو ظاہر کرتا ہے۔

اب تک مطالعے میں موضوع بننے والے مرد کرداروں کے دوسرے یعنی بہن کے کردار پر غور کیا جائے تو عورت کا یہ روپ اس قسم کے جملوں:

> مایا نے از خود اپنے آپ کو سماج کے روح فرسا احکام کے تابع کر لیا تھا۔ اس نے اپنے تمام اچھے کپڑے اور زیورات کی پٹاری ایک صندوق میں مقفل کر کے چابی ایک جوہڑ میں پھینک دی تھی۔(11)

میں ملفوف نظر آتا ہے مگر اس کردار کے لب پر آنے والا پاٹ: "ہری ہر ہری ہر، ہری ہر، ہری میری بار کیوں دیر اتنی کری" (12) دراصل ایک ایسا سوال ہے جو مابعدالطبیعیاتی سطح پر مزاحمت کو ظاہر کر رہا ہے۔ اگر چہ افسانے کی مجموعی فضا میں مایا کا کردار ایک مثالی عورت کا کردار ہے جو خاندان سے سماج تک کے تمام افراد سے احسن انداز میں نبھا رہی ہے لیکن اس کے لبوں پر آنے والا سوال (جو بظاہر حاشیائی درجہ رکھتا ہے) لاتشکیلی پڑھت کے دوران اہمیت اختیار کر لے گا اور مزاحمت کا اشارہ شمار ہو گا۔

اب تک کی پڑھت کے دوران موضوع بننے والے کرداروں کے حوالے سے (حکمت عملی کی وضاحت میں) لکھا جا سکتا ہے کہ مرکزی کردار کے مطالعے سے اس کا آغاز ہوا تھا اور (ترتیب وار) حاشیائی آوازوں تک منتج ہوا۔ چوں کہ لاتشکیلی فلسفہ غیر (Other) کی میزبانی کا فلسفہ ہے اس لیے پڑھت کا انحصار اسی پہلو پر رہا۔ البتہ "بھولا" میں سامنے آنے والے مختلف کرداروں سے آوازوں تک کے مطالعے میں مشترک قدر اس بات کو قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہاں سماجی توثیق کی حیثیت رکھنے والے ملفوف نظریات پر مشتمل بیانیوں سے انحراف کیا جا رہا ہے۔ چناں چہ (لکھا جا سکتا ہے کہ اگر) روایتی پڑھت کے نتیجے میں یہ افسانہ بچپن کی معصومیت کا حوالہ سمجھا گیا تھا تو (فی الوقت) اس میں مخصوص بیانیوں سے انحراف ظاہر ہوا ہے تاہم اس نتیجے کو بھی متن پر کلی حیثیت میں منطبق نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ معنی کا یہ پڑاؤ بھی قاری کی سہولت کا ایک اشارہ ہے وگرنہ زبان کی جانب سے معنی آفرینی کی دعوت برقرار ہے۔ لہٰذا اس مقام پر پہنچ کر لکھا جا سکتا ہے کہ افسانے اور ناول میں موضوع بننے والے متضاد کرداروں اور تصورات کے درمیان قائم ہونے والی ترجیح، ایک ایسی گتھی ہے جسے سلجھانا لاتشکیلی پڑھت کا اولین مقصد ہے۔ چناں چہ اس نہج سے اردو فکشن کی پڑھت یقینی طور پر معنی کے نئے در وا کر سکتی ہے۔

حوالہ جات:

1. Jacques Derrida, *Margins of Philosophy*, trans. By Alan Bass, (Brighton: The Harvester Press, 1982), 310.
2. Jacques Derrida, *Dissemination*, trans. By Barbara Johnson, (London: The Athlone Press, 1981), 105.
3. Jacques Derrida, *Of Grammatology*, trans. By Gayatri Chakravorty Spivak (Baltimor& London: The John Hopkins University Press, 1976), 158.
4. Niall Lucy, *A Derrida Dictionary* (London: Blackwell Publishing, 2004), 43.
5. Jacques Derrida, *Deconstruction and The Possibility of Justice*, edited, by Duceilla Cornell (New York: Routledge, 1992), 15.
6. Jacques Derrida, *Derrida and Difference*, edited by David Wood, Robert Bernaserni (Evanston: Northwestern University Press, 1998), 3.
7. ڈاکٹر شافع قدوائی، فکشن مطالعات (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۵)، ۱۲۳۔
8. راجندر سنگھ بیدی، راجندر سنگھ بیدی کے انمول افسانے (لاہور: عبداللہ اکیڈمی، ۲۰۱۰)، ۱۰۔
9. ایضاً
10. ایضاً، ص، ۹
11. ایضاً
12. ایضاً، ص، ۱۰

References in Roman:

1. Jacques Derrida, *Margins of Philosophy*, trans. By Alan Bass, (Brighton: The Harvester Press, 1982), 310.
2. Jacques Derrida, *Dissemination*, trans. By Barbara Johnson, (London: The Athlone Press, 1981), 105.
3. Jacques Derrida, *Of Grammatology*, trans. By Gayatri Chakravorty Spivak (Baltimor& London: The John Hopkins University Press, 1976), 158.
4. Niall Lucy, *A Derrida Dictionary* (London: Blackwell Publishing, 2004), 43.
5. Jacques Derrida, *Deconstruction and The Possibility of Justice*, edited, by Duceilla Cornell (New York: Routledge, 1992), 15.

6. Jacques Derrida, *Derrida and Difference*, edited by David Wood, Robert Bernaserni (Evanston: Northwestern University Press, 1998), 3.
7. Dr. Shafe Qidwai, ***Fiction Mutaliat*** (Multan: Beacon Books, 2015), 123.
8. Rajindar Singh Bedi, ***Ranjindar Singh BediKe Anmol Afsane*** (Lahore: Abdullah Aacademy, 2010), 10.
9. Ibid
10. Ibid, 09.
11. Ibid
12. Ibid, 10

INSTITUTE OF URDU LANGUAGE AND LITERATURE